بحث ونظر

سیاستِ شرعیہ: مفہوم، مقصد اور دائرۂ کار

(امام ابن تیمیہؒ کے افکار کا مطالعہ)

مولانا محمد جرجیس کریمی

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ کی ایک اہم کتاب 'السیاسۃ الشرعیۃ فی اصلاح الراعی والرعیۃ' ہے۔ اس میں انہوں نے قرآن وحدیث کی روشنی میں اسلامی سیاست کی توضیح وتشریح کی ہے۔ اس مضمون میں اسی کتاب کا خلاصہ پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

علامہ ابن تیمیہ نے سب سے پہلے درج ذیل آیات سے والیانِ حکومت کی مدد ونصرت پر استدلال کیا ہے:

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُم بَيْنَ النَّاسِ أَن تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ إِنَّ اللَّهَ نِعِمَّا يَعِظُكُم بِهِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ سَمِيعًا بَصِيرًا۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا (النساء: ۵۸-۵۹)

(مسلمانو!) اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے سپرد کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔ اللہ تم کو نہایت عمدہ نصیحت کرتا ہے اور یقینا اللہ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں، پھر اگر

تمہارے درمیان کسی معاملے میں نزاع ہوجائے تو اسے اللہ اور رسول
کی طرف پھیر دو، اگر تم واقعی اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔
یہی ایک صحیح طریقۂ کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بہتر ہے۔

امام موصوف لکھتے ہیں کہ علماء نے ان آیات کے بارے میں کہا ہے کہ ان میں سے پہلی آیت حکم رانوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ وہ امانتوں کو ان کے اہل کے سپرد کریں اور جب فیصلہ کریں تو انصاف کی ساتھ کریں اور دوسری آیت رعایا اور ماتحت فوجیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ وہ اولوالامر کی اطاعت کریں، الّا یہ کہ وہ اللہ کی معصیت کا حکم دیں تو ایسی صورت میں اطاعت واجب نہیں ہے۔امام موصوف کے نزدیک امانتوں کو ان کے اہل کے حوالہ کرنا اور عدل وانصاف کے مطابق فیصلے کرنا سیاستِ عادلہ اور صالح حکومت کی بنیاد ہے۔(ص ۶)

امام ابن تیمیہؒ امانت کی دو قسمیں قرار دیتے ہیں: ایک مناصب اور دوسری اموال۔ پہلی قسم کے حوالے سے انھوں نے لکھا ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر جب رسول اللہ ﷺ نے خانۂ کعبہ کی کنجی بنوشیبہ کے سردار عثمان بن طلحہ سے طلب فرمائی اور اس میں داخل ہوکر نماز پڑھی، اس وقت حضرت عباس بن عبدالمطلبؓ نے آپؐ سے گزارش کی کہ کعبہ کی کنجی مجھے عطا کردی جائے۔اس موقع سے یہ آیت نازل ہوئی۔ اس سے انھوں نے یہ استدلال کیا ہے کہ حکم رانوں پر واجب ہے کہ وہ سرکاری مناصب مستحقین کو عطا کریں اور محبت وقرابت کی بنا پر کسی کو والی نہ بنائیں۔نہ ایسے شخص کو کوئی عہدہ دیں جو خود اس کا طالب ہو اور نہ شفقتِ پدری کی بنیاد پر کسی کے ساتھ ترجیحی سلوک کریں اور نہ مستحق کو نظر انداز کرکے غیر مستحق کو کوئی عہدہ دیں۔ان امور کے ضمن میں انھوں قرآن وحدیث کی مختلف نصوص کا حوالہ دیا ہے (ص ۷)

امام موصوف لکھتے ہیں کہ جس نے سب سے زیادہ حق دار اور اہل کو منصب دینے سے اعراض کیا اور کسی نااہل کو منصب عطا کردیا، چاہے اس کی کوئی بھی وجہ ہو، اس نے اللہ اور اس کے رسول اور اہلِ ایمان کے ساتھ خیانت کی۔وہ لکھتے ہیں کہ کوئی بھی

منصب ہو، اسے سب سے زیادہ موزوں شخص کو دیا جائے گا۔ لیکن اگر موزوں شخص نہ مل سکے تو اس صورت میں جس قابلیت کا آدمی میسر ہو، اس پر اکتفا کیا جائے گا۔ (ص ۱۲)

انہوں نے اہل شخص کے انتخاب کے لیے بنیادی طور پر دو شرائط بیان کی ہیں: پہلی شرط ہے قوت اور دوسری ہے امانت (القصص: ۲۶، یوسف: ۵۴) طاقت و قوت کی ضرورت ہر منصب اور محکمے کے مطابق ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر لشکر کی امارت و سرداری کے لیے دل کی بہادری، لڑائی کی مہارت، جنگی حیلہ سازی اور چالاکی و ہنرمندی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ تیر اندازی، گھڑسواری، حربی طور طریقے جاننا بھی ضروری ہوتا ہے، جب کہ محکمۂ عدالت کے لیے قاضی کی قوت، عدل و انصاف کے تقاضوں سے واقف ہونا، کتاب و سنت کے دلائل کو جاننا، احکام نافذ کرنے کی صلاحیت رکھنا اور خوفِ خدا اور تقویٰ سے متصف ہونا ہے (ص ۱۳۔ ۱۴)

یہ بات بھی واضح رہنی چاہیے کہ یہ صلاحیت لوگوں میں کم ہی پائی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے حضرت عمر بن خطابؓ کہا کرتے تھے کہ ''اے اللہ! میں فاجر کی چستی و چالاکی اور ثقہ کے عجز و بے بسی کا شکوہ کرتا ہوں''۔ ہر منصب کے لیے وہی شخص موزوں ہے جو اس کے مناسبِ حال ہو، جیسے جنگ کے موقع پر سپہ سالار بنانے کے لیے فاجر، لیکن بہادر شخص کو متقی، لیکن کم زور پر ترجیح دینی چاہیے، کیوں کہ فاجر قوی کی قوت کا فائدہ مسلمانوں کو پہنچے گا اور اس کے فجور کا نقصان صرف اس کی ذات کو لاحق ہوگا، جب کہ صالح ضعیف کا صلاح و تقویٰ اس کی ذات کے لیے منفعت بخش ہوگا، لیکن مسلمانوں کے لیے اس کا ضعف ہلاکت خیز ہوگا۔ علامہ ابن تیمیہؒ نے اس حوالے سے حضرت خالد بن ولیدؓ اور حضرت ابوذر غفاریؓ کا حوالہ دیا ہے۔ اللہ کے رسولؐ نے حضرت خالدؓ کو سپہ سالار بنایا، جب کہ حضرت ابوذرؓ کو کسی طرح کا منصب دینے سے منع کر دیا (ص ۱۵۔۱۶) اسی طرح آپؐ نے غزوہ ذات السلاسل میں حضرت عمر بن العاصؓ کو ان صحابہ پر امیر بنایا جو ان سے افضل تھے، تاکہ وہ اپنی قوم کے لوگوں کو

اسلام کی طرف مائل کرسکیں۔ آپؐ نے حضرت اسامہ بن زیدؓ کو ان کے والد کی شہادت کا انتقام لینے کے لیے امیرلشکر بنایا اور بہت سے جلیل القدر صحابہ کو ان کی قیادت میں روانہ کیا۔ آپؐ کا معمول تھا کہ کبھی کسی شخص کو کسی مصلحت کی بنا پر سپہ سالار بنا دیتے تھے اور اکابرِ صحابہ کو اس کے ماتحت کر دیتے تھے، جو علم وعمل میں اس سے فائق اور افضل ہوتے تھے۔ انہی مصلحتوں کی وجہ سے مرتدین کی سرکوبی کے لیے حضرت ابوبکرؓ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو سپہ سالار بنائے رکھا، باوجود اس کے کہ ان سے چند غلطیاں سرزد ہوگئی تھیں، لیکن ان کو معزول نہیں کیا (۱۵۔۱۶)

امام موصوف نے آگے وضاحت کی ہے کہ خلیفۃ المسلمین کو متضاد اخلاق واوصاف کے حاملین کی ضرورت ہوتی ہے، مثال کے طور پر اگر وہ خود نرم مزاج ہو تو نائب سلطنت کو ایسا ہونا چاہیے جو شدت کی طرف مائل ہو اور اگر خلیفہ المسلمین کے مزاج میں شدت اور غضب ہو تو اس کے نائب کو نرم دل ہونا چاہیے، تاکہ دونوں کے امتزاج سے اعتدال پیدا ہوجائے۔ (ص ۱۷)

وہ فرماتے ہیں کہ ولایت وحکم رانی کا بنیادی مقصد خلقِ خدا کے دین کی اصلاح ہے۔ پس اگر لوگوں کا دین برباد ہو تو ان کا نقصان وخسران ہلاکت آفریں ہوگا اور نتیجہ کے طور پر دنیا کی نعمتیں ان کو کچھ فائدہ نہ دے سکیں گی۔ دنیاوی امور، جن کے بغیر لوگوں کا دین قائم نہیں رہ سکتا، دو طرح کے ہیں: مستحقین میں مال تقسیم کرنا اور اعتدال سے تجاوز کرنے والوں کو سزائیں دینا۔ جو شخص حق سے تجاوز نہ کرے اور اعمال زندگی میں اعتدال کا راستہ اختیار کیے رہے، اس کے دین ودنیا دونوں کی اصلاح ہوجاتی ہے۔ اس بنا پر حضرت عمرؓ صوبوں کی رعایا کو لکھ بھیجتے تھے کہ: ''میں نے اپنے عمّال کو تمہاری طرف اس غرض سے بھیجا ہے کہ وہ تم کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی تعلیم دیں اور تم لوگوں میں خراج اور مال غنیمت تقسیم کریں''۔ پس جب کسی وجہ سے راعی اور رعایا میں تغیر آجائے تو نظام حکومت بگڑ جاتا ہے۔ (ص ۱۸)

امورِ دین میں سب سے زیادہ ضروری اور اہم نماز ہے۔ نبی ﷺ نے

حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن بھیجا تو فرمایا: ''اے معاذ! میرے نزدیک سب سے اہم اور ضروری کام نماز ہے۔'' حضرت عمر بن الخطابؓ اپنے عمّال کو لکھا کرتے تھے کہ ''میرے نزدیک سب سے اہم کام نماز ہے۔ جس شخص نے اس کی حفاظت کی، اس نے دین کی حفاظت کی اور جس نے اس کو ضائع کر دیا وہ دین کے دیگر احکام کو پامال کرنے میں زیادہ دلیر ہوگا۔'' (۲۰۔۲۱)

امام موصوف لکھتے ہیں کہ ولایات (سرکاری مناصب) کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ اللہ کا دین قائم ہو اور اس کا کلمہ بلند ہو۔ 'کلمۃ اللہ' ایک جامع لفظ ہے، جس میں پوری شریعت شامل ہے۔ رسولوں کی بعثت اور کتابوں کے نزول کا مقصد یہ ہے کہ لوگ عدل وقسط کے ساتھ حقوق اللہ اور حقوق العباد ادا کریں۔ (ص ۲۲)

اس وضاحت کے بعد اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَأَنزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ وَرُسُلَهُ بِالْغَيْبِ (الحدید:۲۵)

اور ہم نے لوہا اتارا جس میں بڑا زور ہے اور لوگوں کے لیے منافع ہیں۔ یہ اس لیے کہ اللہ کو معلوم ہو جائے کہ کون اس کو دیکھے بغیر اس کی اور اس کے رسول کی مدد کرتا ہے۔

امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آیت کے اس ٹکڑے میں فرمایا ہے کہ جو کتاب سے ہٹے گا اس کو 'حدید' یعنی تلوار کے ذریعہ سیدھا کیا جائے گا۔ چنانچہ اس دین کے قائم کرنے کا ذریعہ اللہ کی کتاب اور تلوار ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حکم دیا کہ ''جو کتاب اللہ سے ہٹے اسے ہم تلوار سے ضرب لگائیں۔'' پس جب اقامتِ دین مقصود ہے تو سرکاری مناصب کو دینے میں انہی باتوں کا لحاظ کیا جائے گا کہ حسبِ مراتب جو زیادہ دینی احکام اور تعلیمات کا پابند ہو اسی کو منصب اور حکم رانی دی جائے گی۔

امانت کی دوسری قسم مال ہے، جسے اس کے مستحقین کو ادا کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُم بَعْضاً فَلْيُؤَدِّ الَّذِىْ اؤْتُمِنَ أَمَانَتَهُ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهُ (البقرۃ: ۲۸۳)

اگر تم میں سے کوئی شخص دوسرے پر بھروسہ کرکے اس کے ساتھ کوئی معاملہ کرے تو جس پر بھروسہ کیا ہے اسے چاہیے کہ امانت ادا کرے اور اللہ اپنے رب سے ڈرے۔

اس مال میں اعیان، قرض، ہبہ، شراکت، وکالت، مضاربت، مالِ یتیم، اوقاف، قرض کی ادائیگی، عورتوں کا مہر اور اجرتیں وغیرہ شامل ہیں۔امام موصوف نے اس طرح کے اموال کی ادائیگی کو امانت کی ادائیگی قرار دیا ہے اور قرآن وحدیث سے متعدد نصوص بہ طور دلیل نقل کی ہیں۔انھوں نے مال مسروقہ مغصوبہ اور خیانت کے مال کی واپسی، اس طرح عاریت میں لیے ہوئے مال کی واپسی کو بھی امانت میں شمار کیا ہے، جس کا ادا کرنا واجب ہے اور اس کے مخاطب حکم راں اور رعایا دونوں ہیں۔ چنانچہ حکمراں اور ان کے نائبین پر ضروری ہے کہ صاحب حق کا حق ادا کریں۔اسی طرح ٹیکس وصول کرنے والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ خزانے میں مال جمع کردیں۔علیٰ ھذا القیاس رعایا پر بھی واجب ہے کہ وہ اپنے حقوق ادا کردیں اور ایسے مال کا مطالبہ نہ کریں جس کا انہیں حق نہیں ہے اور نہ یہ مناسب ہے کہ بادشاہِ وقت کے حقوق کو ادا کرنے سے رکیں، اگرچہ وہ ظالم ہی کیوں نہ ہو اور سرکاری اہل کاروں کے لیے بھی مناسب نہیں ہے کہ مال کی تقسیم ادنی خواہشات کے مطابق کریں، کیوں کہ وہ مال کے مالک نہیں، بلکہ امانت دار ہیں (ص ۲۴۔۲۶) جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **انی واللّٰہ لا أعطی أحدًا ولا أمنع أحدًا، وانما أنا قاسم، أضع حیث أمرت** (البخاری) ''بے شک میں از خود نہ کسی کو دیتا ہوں نہ منع کرتا ہوں، بلکہ میں صرف تقسیم کرنے والا ہوں، میں وہی کرتا ہوں جس کا مجھے حکم دیا گیا ہے''۔جب نبی ﷺ کو کسی کو مال دینے یا نہ دینے کا اختیار نہیں تھا تو ظاہر بات ہے کہ عام حکم رانوں کو یہ اختیار کیسے ہوسکتا ہے۔ چنانچہ خلفاء راشدین نے نبی ﷺ کی اسی سنت پر عمل کیا اور مال اس کے مستحقین ہی کو دیا۔ اس کی تائید میں امام

موصوف نے خلیفۂ ثانی حضرت عمر بن الخطابؓ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے اقوال نقل کیے ہیں (ص ۲۶)

قرآن وحدیث کی تعلیمات کے مطابق سرکاری شاہی خزانے کی آمدنی کے ذرائع مالِ غنیمت، اموالِ زکوٰۃ اور مالِ فیی ہیں۔ مال غنیمت کفار سے جہاد کے ذریعے حاصل شدہ مال کو کہتے ہیں۔ قرآن وحدیث میں مال غنیمت کو امت مسلمہ کے لیے حلال قرار دیا گیا ہے۔ امام موصوف نے مال غنیمت کی تقسیم کے سلسلے میں قرآنی احکام بیان کیے ہیں۔ ساتھ ہی مزید کچھ تفصیلات بیان کی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر دینی مصلحت کا تقاضا ہو تو مال غنیمت کی تقسیم میں کمی بیشی کی جاسکتی ہے۔ (ص ۲۸۔۲۹)

مال کی دوسری قسم اموالِ زکوٰۃ ہے۔ زکوٰۃ انہی لوگوں میں تقسیم کی جائے گی جن کا ذکر قرآن مجید میں مداتِ زکوٰۃ کو بیان کرنے والی آیت میں ہوا ہے۔ (التوبۃ:۶۰) مزید اس میں کسی کا اضافہ نہیں کیا جائے گا، جیسا کہ ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور مال زکوٰۃ کا سوال کیا۔ آپؐ نے فرمایا: ''اللہ تعالی نے زکوٰۃ کی تقسیم کے سلسلے میں نبی یا کسی اور کو اختیار نہیں دیا ہے، بلکہ اس نے خود تقسیم کردی ہے۔ اگر تم ان آٹھ لوگوں میں سے ہو جن کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے تو تمہیں زکوٰۃ دی جائے گی، ورنہ نہیں۔'' (ص ۳۲)

مال کی تیسری قسم مال فیی ہے۔ اس کا ذکر قرآن مجید میں سورۂ حشر آیت ۷ میں ہوا ہے۔ یہ اس مال کو کہتے ہیں جو کفار سے بغیر لڑائی کے حاصل ہو۔ اس کو فیی اس لیے کہا جاتا ہے، کیوں کہ اللہ تعالی نے اس مال کو کفار سے لے کر مسلمانوں کی طرف لوٹا دیا ہے۔ مال فیی کی مثال جزیہ کی ہے، جو یہود ونصاری پر واجب ہوتا ہے اور اس مال کی مثال ہے جو دشمنوں سے مصالحت کی بنیاد پر حاصل ہوتا ہے، یا کوئی حکم راں خلیفۃ المسلمین کو دیتا ہے، یا اس کی مثال اس مال کی ہے جو حربی یا ذمی تاجروں سے وصول کیا جاتا ہے، جیسا کہ حضرت عمرؓ عہد توڑنے والے سے وصول کرتے تھے، یا اس خراج کی طرح ہے جو لوگوں پر عائد ہوتا ہے۔ اس طرح مال فیی کی تعریف میں تمام سرکاری

اموال شامل ہیں۔مسلمانوں کے بیت المال میں اس مال کو جمع کیا جائے گا جس کا کوئی متعین مالک نہ ہو، جیسے کسی مسلمان کا انتقال ہو گیا اور اس کا کوئی وارث نہ ہو، یا مغصوبہ مال جس کا اصل مالک موجود نہ ہو، یا عاریت میں لیا ہوا مال، یا ہبہ میں دیا ہوا مال جس کے مالک کا پتہ نہ ہو، چاہے وہ منقولہ ہو یا غیر منقولہ، یہ سب سرکاری مال شمار ہوں گے۔

اموال کے مصارف کے سلسلے میں وہی طریقہ اختیار کیا جائے گا جو مصلحت سے قریب تر ہو اور جس سے نفع کا امکان زیادہ ہو۔ چنانچہ مال فیی درجہ بدرجہ مسلمانوں میں تقسیم کیا جائے گا۔سب سے پہلے ان فوجیوں کو دیا جائے گا جو جہاد میں مصروف ہیں۔ اس لیے کہ مال فیی ان کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا تھا۔اسی وجہ سے بعض فقہاء نے لکھا ہے کہ مال فیی فوجیوں کے لیے مخصوص مال ہے۔ مستحقینِ مال فیی میں سرکاری عہدے دار، مثلاً گورنر، قضاۃ، علماء اور مال جمع کرنے والے اور اس کی حفاظت کرنے والے، حتیٰ کہ ائمہ ومؤذنین بھی شامل ہیں۔(ص ۴۲) اسی طرح اس مال کو ان مصارف میں خرچ کیا جائے گا جن کا نفع عام ہے، جیسے سرحد کی حفاظت، اسلحہ کی تیاری، راستوں، پلوں اور نہروں کی تعمیر وغیرہ۔

علامہ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ حاکم وقت کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی کو اپنی خواہش پر یا قرابت ومودت کی بنیاد پر کوئی ممکنہ نفع حاصل کرنے کے ارادے سے مال دے، جیسے مخنثوں کو یا گانے بجانے والوں کو یا کرتب دکھانے والوں کو یا جوتشی اور قسمت بتانے والوں کو مال دیا جائے۔(ص ۴۲۔ ۴۳)

وہ مزید لکھتے ہیں کہ مال فیی تالیفِ قلب کے لیے دیا جاسکتا ہے، جیسا کہ نبی کریم ﷺ کے مختلف واقعات سے پتا چلتا ہے۔ اس ذیل میں دو طرح کے لوگ آتے ہیں: ایک وہ کافر جس کے اسلام لانے کی امید ہو، یا اس سے پہنچنے والے ممکنہ ضرر کو دفع کرنا مقصود ہو، دوسرا وہ مسلمان جس کے ذریعہ اس کے رابطے میں رہنے والے دوسرے لوگوں کے اسلام لانے کی امید ہو، یا جس کے ایمان کی تقویت، یا ضرر کو روکنا مقصود ہو۔اس طرح کی تمام نوازشات بہ ظاہر مال داروں کو مال عطا کرنے اور کم

زوروں کو ترک کر دینے کے مترادف ہے، لیکن اعمال کا دارومدار نیت پر ہے، چنانچہ اگر ان عطایا کے ذریعہ دین کی مصلحت مقصود ہے تو گویا یہ نبی ﷺ اور آپ کے خلفاء کے عطایا کے مثل ہیں، لیکن اگر اس کا مقصود زمین میں فتنہ وفساد پھیلانا اور برتری حاصل کرنا ہے تو اس کی مثال فرعون کے عطایا کی ہوگی۔ (ص ۴۴۔ ۴۵)

امام موصوف لکھتے ہیں کہ افضل ایمان سخاوت اور صبر ہے۔ مخلوق کی رعایت جود وسخاوت اور صبر وشجاعت کے بغیر ممکن نہیں۔ چنانچہ قرآن میں سخاوت کی فضیلت اور بخل کی مذمت، اس طرح شجاعت کی فضیلت اور بزدلی کی مذمت پر متعدد آیات وارد ہیں۔ انہوں نے حکم رانوں کی تین قسمیں قرار دی ہیں: پہلی قسم ان کی ہے جو برتری اور زمین میں فتنہ وفساد کے طالب ہوتے ہیں، جو اپنی عاقبت کو نہیں دیکھتے، چنانچہ لوگوں سے ناجائز طریقے سے مال وصول کرتے ہیں اور ناجائز طریقے پر خرچ بھی کرتے ہیں۔ دوسری قسم ان حکم رانوں کی ہے جن کے اندر اگرچہ اللہ کا خوف ہوتا ہے اور وہ خلقِ خدا پر ظلم کو حرام سمجھتے ہیں، لیکن اس کے باوجود یہ سمجھتے ہیں کہ سیاست کے تقاضے اس کے بغیر پورے نہیں ہوسکتے۔ چنانچہ وہ حرام کاموں میں شریک ہوجاتے ہیں اور فرائض کو ترک کر دیتے ہیں۔ تیسری قسم ان حکم رانوں کی ہے جن کا معاملہ مذکورہ دونوں قسم کے حکم رانوں کے درمیان رہتا ہے۔ وہ شریعت اسلامی کو ماننے والے ہوتے ہیں۔ مال کو لوگوں کے نفع کے لیے حسب ضرورت خرچ کرتے ہیں۔ اس سے ان کا مقصود ان کے احوال کی اصلاح اور دین کی اقامت ہوتی ہے۔ یہ حضرات لوگوں سے مال کا ناجائز مطالبہ نہیں کرتے اور تقوی اور احسان کی روش پر قائم رہتے ہیں۔ (ص ۴۷۔ ۴۸)

امام موصوف لکھتے ہیں کہ سیاستِ دینیہ اس کے بغیر پوری نہیں ہوسکتی اور دین و دنیا کی مصلحتیں اسی طریقے سے حاصل ہوسکتی ہیں۔ انہوں نے سیاست عادلہ کا حامل ان حکم رانوں کو قرار دیا ہے جو فرائض کو قائم کرتے ہیں، محرمات کو ترک کرتے ہیں، صرف ان کو عطا کرتے ہیں جن کو عطا کرنا دین کی مصلحت ہو اور صرف وہ لیتے ہیں جو ان کے لیے حلال ہو، جب محارم کا ارتکاب کیا جائے تو غضب ناک ہوجاتے ہیں اور وہ اپنی

ذات کے لیے انتقام نہیں لیتے، بلکہ معاف کر دیتے ہیں۔(ص ۴۹۔۵۰)

سیاست شرعیہ کا دوسرا اساسی محل حدود کا قیام ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ (النسائ:۵۸)

اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔

لوگوں کے درمیان فیصلے دو چیزوں میں ہوتے ہیں: ایک حدود، دوسرے حقوق۔ ان کی دو قسمیں ہیں: پہلی قسم ان حدود و حقوق کی ہے جن کا تعلق کسی معین قوم سے نہ ہو، بلکہ اس کی منفعت بلاتخصیص عام مسلمانوں (یا انسانوں) کو پہنچتی ہو اور سب کے سب ان منفعتوں کے حاجت مند ہوں۔ ان فیصلوں کو 'حدود اللہ' کہتے ہیں، جیسے چوروں، ڈاکوؤں یا زانیوں پر حد شرعی نافذ کرنا، یا جیسے سرکاری اموال یا اوقاف یا ان وصیتوں کے نزاعات کا فیصلہ کرنا جو کسی معین شخص کے لیے نہ کی گئی ہوں۔ اس کو 'حقوق العباد' کہتے ہیں اور یہ حکومت و سیاست کے اہم امور میں سے ہیں۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ نے حضرت علیؓ کا قول نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''مسلمانوں پر کسی نہ کسی امیر یعنی حکم راں کا ہونا لازم ہے، خواہ وہ نیک ہو یا فاجر۔ ان سے پوچھا گیا کہ نیک اور انصاف پسند حکم راں کی بات تو سمجھ میں آتی ہے، لیکن فاجر حاکم سے مسلمانوں کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ اس کا انہوں نے یہ جواب دیا کہ ''اس کے ذریعہ بھی حدود شرعیہ قائم ہوں گی، راستے پر امن رہیں گے، دشمن سے جہاد کیا جائے گا اور مال فیی تقسیم ہوگا''۔(ص ۵۱)

یہ وہ قسم ہے جس کو وجود میں لانا اور اس کے قیام کے لیے کوشاں رہنا حکام پر واجب ہے، خواہ اس کے لیے کسی کی طرف سے دعوی کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ حد جاری کرنے میں شریف وغیر شریف اور قوی وضعیف کے ساتھ یکساں سلوک کیا جائے گا۔ حاکم کے لیے کسی طرح جائز نہیں ہے کہ کسی کی سفارش پر یا ہدیہ قبول کر کے حد جاری کرنے میں لیت ولعل کرے۔ جو شخص حد جاری کرنے کی قدرت رکھتا ہو اس کے باوجود حد کو معطل کر دے، اس پر اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہے۔(ص ۵۱)

امام موصوف آگے لکھتے ہیں کہ یہ بھی جائز نہیں ہے کہ زانی، چور، شرابی اور

ڈاکو سے مال لے کر حد معطل کر دی جائے، چاہے وہ بیت المال کے لیے ہی کیوں نہ لیا گیا ہو۔ اس طرح لیا ہوا مال سخت حرام ہے اور ایسا کرنے والا حاکم دو فسادوں کو جمع کرنے والا کہلائے گا: ایک اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ حدود کو معطل کرنا اور دوسرا حرام خوری۔ (ص ۵۵)

وہ مزید لکھتے ہیں کہ جب حاکم وقت رشوت کھائے گا تو لازماً وہ جھوٹ سنے گا، جو کہ 'شہادۃ زور' میں سے ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے رشوت لینے والے، دینے والے اور دلانے والے، سب پر لعنت کی ہے۔ انھوں نے عہد نبوی کے ایک شخص کے بیٹے کا واقعہ بیان کیا ہے جس نے ایک عورت سے زنا کیا تھا۔ لوگوں نے اس کو بتایا کہ تمہارا بیٹا سنگ سار کیا جائے گا، چنانچہ سنگ ساری سے بچنے کے لیے اس نے عورت کے شوہر کو سو بکریاں اور ایک خادم دیا۔ بعد میں جب اس نے براہ راست نبی ﷺ سے دریافت کیا تو آپؐ نے بکریاں اور خادم واپس کرنے کا حکم دیا اور اس پر حد جاری کرنے کا فرمان جاری کیا۔ ساتھ ہی اس عورت پر بھی، جس سے اس لڑکے نے اس کے مرضی سے زنا کیا تھا، حد جاری کرنے کا حکم دیا۔

علامہ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ لوگوں کے معاملات میں جو فساد رونما ہوتا ہے وہ مال و منصب کے ذریعہ حد کو معطل کر دینے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ حاکم وقت اقامت حدود اور منکرات پر نگیر کرنے کو مال لے کر ترک کر دے تو یہ چیز بدکاری پر دلالی کرنے کے مثل ہوگی، کیوں کہ حکومت کی بنیادی ذمہ داری معروف کا حکم دینا اور منکر کو روکنا ہے، پس جب وہ اس کو انجام نہ دے تو گویا یہ ایسے ہی ہوا کہ جس کا کام دشمنوں کی مخالفت کرنا تھا اسی نے دشمنوں کی حمایت کی۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ گویا اس نے جہاد فی سبیل اللہ کے لیے مال لیا اور اس کے ذریعے مسلمانوں سے جنگ کی۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ بندوں کی صلاح امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں ہے اواسی میں اس کی معاش ومعاد کی فلاح ہے۔ (ص ۵۸)

وہ رقم طراز ہیں کہ امر بالمعروف میں نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، سچائی، امانت،

والدین کے ساتھ حسن سلوک، صلہ رحمی، اہل وعیال کے ساتھ حسن معاشرت، پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک، سب مراد ہیں۔ حاکم وقت پر واجب ہے کہ ان سب باتوں کا حکم دے اور ان کے ترک کرنے والے کو سزا دے۔ اگر ان کی تارک پوری جماعت ہو تو اس سے قتال کرے۔ اسی طرح محرمات کے مرتکب، فتنہ وفساد کے خوگر اور منکرات انجام دینے والے سے بھی قتال کیا جائے گا، یہاں تک کہ پورا دین اللہ کے لیے ہو جائے۔ اس بات پر تمام علماء کا اتفاق ہے۔ (ص ۵۹)

امر بالمعروف ونہی عن المنکر ہی کا ایک حصہ باغیوں اور ڈاکوؤں کو سزا دینا ہے، جو راستوں میں اسلحے کے ذریعے سے لوگوں کے مال چھین لیتے ہیں۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

إِنَّمَا جَزَاؤُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ ذَٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ (المائدۃ: ۳۳)

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور تگ و دو کرتے پھرتے ہیں کہ زمین میں فساد برپا کریں، ان کی سزا یہ ہے کہ قتل کیے جائیں، یا سولی پر چڑھائے جائیں، یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں، یا جلاوطن کر دیے جائیں۔ یہ ذلت و رسوائی تو ان کے لیے دنیا میں ہے اور آخرت میں ان کے لیے اس سے بڑی سزا ہے۔

امام شافعیؒ حضرت ابن عباسؓ کے حوالے سے روایت کرتے ہیں کہ ڈاکوؤں نے اگر لوگوں کا قتل کیا ہو اور مال لوٹا ہو تو ان کو قتل کیا جائے گا اور سولی دی جائے گی اور اگر انہوں نے قتل کیا اور مال نہ لوٹا ہو تو ان کو قتل کیا جائے گا، سولی نہیں دی جائے گی۔ اور اگر انہوں نے مال لوٹا ہو اور کسی کا قتل نہ کیا ہو تو ان کے ہاتھ پیر مختلف سمتوں سے کاٹے جائیں گے۔ اور اگر انہوں نے راستوں کو پرخطر بنا دیا ہو، لیکن مال نہ لوٹ سکے ہوں تو انہیں جلاوطن کر دیا جائے گا''۔ امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ یہی موقف متعدد فقہاء کا ہے

، جیسے امام شافعی، امام احمد، اور امام ابوحنیفہ رحمہم اللہ (ص ۶۲)

جہاں تک باغیوں کا سوال ہے جو لوگوں کو مال لوٹنے کے لیے قتل کرتے ہیں، ان کا ضرر عام ہے اور وہ چوروں کے مثل ہیں۔ ان کا قتل اللہ کی طرف سے مقررہ حد شمار ہوگا۔ یہ فقہاء کے درمیان متفق علیہ مسئلہ ہے، یہاں تک کہ اگر قاتل مقتول کے ہم رتبہ نہ ہو، مثلاً قاتل آزاد ہو اور مقتول غلام، یا قاتل مسلمان ہو اور مقتول ذمی یا مستامن تو اس صورت میں بھی اسے قتل کی سزا دی جائے گی۔ اگر باغیوں کی پوری جماعت ہو اور ان میں سے کسی ایک نے قتل کیا ہو اور باقی لوگ اس کے مددگار ہوں تو جمہور فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ سب کو قتل کیا جائے گا، اگرچہ ان کی تعداد سو ہو۔ یہی خلفاء راشدین کا طریقہ رہا ہے۔

تمام قسم کے باغیوں اور ڈاکوؤں پر جب قدرت حاصل ہو جائے، وہ گرفت میں آ جائیں اور حاکم وقت ان پر حد قائم کرنا چاہے اور وہ اسے نہ قائم ہونے دیں تو مسلمانوں پر واجب ہے کہ ان کے خلاف قتال کریں، یہاں تک کہ ان کو مکمل طریقے سے قابو میں کیا جا سکے۔ فقہاء کا اس پر اتفاق ہے۔ اگر وہ قانون کے سامنے سر تسلیم خم نہ کریں تو ان سے قتال کیا جائے گا۔ اس سلسلے میں اگر ان کے قتل کی نوبت آ جائے تو قتل بھی کیا جائے گا، چاہے انہوں نے خود کسی کا قتل نہ کیا ہو۔ مزید یہ کہ اس کے خلاف بھی قتال کیا جائے گا جو ان کی حمایت کرے اور ان کو مدد پہنچائے۔ ان لوگوں سے قتال کرنا ان تمام گروہوں سے قتال سے زیادہ ضروری اور مؤکد ہے جو شرائع اسلام سے سرتابی کرتے ہیں، کیوں کہ انہوں نے جان و مال اور کھیتی و نسل کو نقصان و تباہ کرنے کے لیے گروہ بندیاں کر رکھی ہیں۔ ان کی مثال ان فتنہ پردازوں کی سی ہے جنہوں نے کسی قلعہ یا غار یا پہاڑ کی چوٹی یا کسی وادی میں پناہ لے رکھی ہو اور وہ وہاں سے گزرنے والوں پر لوٹ مار کرتے ہوں اور جب ان سے کہا جائے کہ وہ خود کو قانون کے حوالے کر دیں تو وہ قتال پر آمادہ ہو جاتے ہوں۔ لیکن واضح رہے کہ ان سے قتال کفار سے قتال کے مانند نہیں ہے۔ لہٰذا ان کا مال (مال غنیمت کے طور پر) نہیں لیا جائے گا، الّا یہ کہ انہوں نے دوسروں کا مال لوٹا ہو تو ان سے تاوان وصول کیا جائے گا۔ ان سے قتال کا بنیادی مقصد

اقامتِ حد اور ان کو فساد انگیزی سے روکنا ہے۔ اگر ان میں سے کوئی فرار ہو جائے تو اس کا تعاقب نہیں کیا جائے گا، الّا یہ کہ اس پر حد واجب ہو۔ ان میں جو قید کر لیا جائے اس پر حد جاری ہو گی۔ اگر یہ غارت گر اسلام کے دشمنوں سے مل جائیں اور اسلامی فوج سے مقابلہ کریں تو ان سے کفار سے قتال کے مثل معاملہ کیا جائے گا۔ (ص ۶۹۔ ۷۰)

مظلوموں کے لیے جائز ہے کہ اپنی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کے لیے محاربین اور ڈاکوؤں سے جنگ کریں، کیوں کہ شریعت میں جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کا حکم دیا گیا ہے، البتہ اگر ان غارت گروں کا مقصد محض مال حاصل کرنا ہو اور کچھ مال دے کر ان سے چھٹکارا حاصل کرنا ممکن ہو تو ایسا کرنا جائز ہے، لیکن عزت و آبرو ان کے حوالے کرنا کسی طرح جائز نہیں۔ (ص ۷۱۔ ۷۲)

امام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ حاکمِ وقت کے لیے یہ جائز نہیں کہ مال داروں سے اس کام کی اجرت وصول کریں کہ وہ رہزنوں اور ڈاکوؤں کو پکڑیں گے اور ان پر حد قائم کریں گے، بلکہ ان کی تلاش اور سرکوبی اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہو گی اور اس کے مصارف بیت المال سے ادا جائیں گے۔ (ص ۷۲۔ ۷۳)

جس شخص نے کسی محارب، چور یا قاتل کو پناہ دی، یا اس کی حمایت کی تو وہ بھی جرم میں برابر کا شریک ہے۔ اور اگر علم رکھنے والا شخص مطلوبہ شخص یا مال کی نشان دہی کرنے سے گریز کرے تو اس کو قید کی سزا دی جائے گی، یہاں تک کہ وہ اس کی اطلاع کرے، اس لیے کہ اس نے ایک حق کی ادائیگی میں، جو اس پر واجب تھا، پہلو تہی کی، لیکن یہ واضح رہے کہ اس کو اسی وقت سزا دی جائے گی جب یہ یقین ہو جائے کہ اس کو مطلوبہ شخص یا مال کے بارے میں علم ہے۔ اس کو اس کی وجہ سے سزا نہیں دی جائے گی کہ اس نے بذاتِ خود خیانت کی ہے۔ (ص ۷۳)

مجرم پر جرم ثابت ہونے یا اس کا اقرار کرنے کے بعد سزا کے نفاذ میں تاخیر کرنا درست نہیں ہے اور نہ مجرم کو قید کرنا اور سزا کے بدلے میں اس سے مال لینا جائز ہے، بلکہ حد قائم کرنی ہی ضروری ہے۔ کیوں کہ اقامتِ حدود جہاد کی طرح عبادات میں

سے ہے۔ اسے قائم کرنا اس لیے بھی ضروری ہے، تاکہ لوگ جان لیں کہ اقامتِ حدود اللہ کی طرف سے بندہ پر رحمت ہے۔ حاکم وقت کو اقامتِ حد کے سلسلے میں سخت ہونے کی ضرورت ہے۔ اسے چاہیے کہ بے جا انسانی ہمدردی کے جذبے سے حدود کو معطل نہ کردے، جس طرح باپ اپنے بچے کو ادب سکھانے کے لیے مارتا، یا معالج اپنے مریض کو بیماری سے شفا دینے کے لیے ناگوار دوا پلاتا ہے، اسی طرح حاکمِ وقت اپنی رعایا پر حدود قائم کرکے ان کو منکرات سے بچاتا ہے۔ جب اس کا مقصد محض اللہ کی رضا جوئی ہو تو اللہ تعالی اس کے لیے لوگوں کے دلوں کو نرم کردے گا، لیکن اگر اس کا مقصد بڑائی و برتری کی طلب یا حصولِ مال ہو تو اس کا نتیجہ بھی برعکس ظاہر ہوگا۔ (ص ۷۹۔ ۸۰)

چوری کی سزا قطع ید (ہاتھ کاٹنا) ہے۔ اس کا حکم قرآن کریم (المائدہ: ۳۸) میں دیا گیا ہے۔ چور کا ہاتھ اس وقت کاٹا جائے گا جب اس نے نصاب کے بقدر چوری کی ہو (نصاب کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے)۔ اسی طرح یہ سزا اس وقت دی جائے گی جب چور نے محفوظ مال چوری کیا ہو، لیکن اگر اس نے ضائع ہونے والے مال کو لیا ہو، یا ایسے درخت کا پھل توڑا ہو جو صحرا میں بغیر احاطے کے تھا، یا ایسے چوپائے کو چرایا ہو جس کا کوئی چرواہا نہ ہو، تو اس میں قطع ید کی سزا نہیں دی جائے گی، بلکہ ایسا کرنے والے کی تعزیر کی جائے گی اور مسروقہ مال پر دوگنا جرمانہ عائد کیا جائے گا۔ (اس میں بھی علماء کا اختلاف ہے) جہاں تک جیب کتروں کا سوال ہے تو ان کو بھی صحیح قول کے مطابق ہاتھ کاٹنے کی سزا دی جائے گی۔ زنا کے جرم میں اگر زانی شادی شدہ ہو تو اس کو رجم کیا جائے گا، یہاں تک کہ وہ مرجائے، جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت ماعز بن مالک اسلمی، غامدیہ اور دو یہودیوں کو رجم کرنے کا حکم دیا تھا اور عہد نبوی کے بعد بھی لوگوں کو رجم کیا گیا۔ اگر زانی غیر شادی شدہ ہے تو قرآن کے بموجب اسے سو کوڑے مارے جائیں گے اور ایک سال کے لیے شہر بدر کیا جائے گا۔ بعض علماء شہر بدری کو واجب قرار نہیں دیتے۔ مجرم پر سزا کا نفاذ اسی وقت ہوگا جب چار گواہوں نے شہادت پیش کردی ہو، یا خود اس نے چار بار اقرار کیا ہو۔ بعض علماء کے نزدیک ایک بار کا اعتراف بھی کافی ہے۔ جہاں تک بدفعلی (عمل قوم لوط) کا

معاملہ ہے تو علماء کے نزدیک اس کی حد زنا کی حد ہے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ اس سے کم تر سزا دی جائے گی۔ صحابہ کا اس پر اتفاق ہے کہ فاعل اور مفعول دونوں کو قتل کر دیا جائے گا، چاہے وہ شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے سنن ابوداؤد کی ایک حدیث سے استدلال کیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''تم اگر دو افراد کو عمل قوم لوط کرتے ہوئے پاؤ تو فاعل اور مفعول دونوں کو قتل کر دو۔''

شراب نوشی کی سزا نبی کریم ﷺ کی سنت اور اجماعِ امت کے مطابق چالیس کوڑے ہیں۔ اگر کوئی شخص چوتھی مرتبہ شراب نوشی کرے تو اس کی سزا قتل ہے۔ اکثر اہل علم کے نزدیک قتل کی سزا منسوخ ہے، لیکن حاکم وقت تعزیراً اسے نافذ کرنا چاہے تو کرسکتا ہے۔ شرابی نے چاہے تھوڑی شراب پی ہو یا زیادہ، علاج کی غرض سے پی ہو یا کسی اور مقصد سے، ہر حال میں اس کو سزا دی جائے گی اور یہ سزا اسی وقت نافذ کی جائے گی جب اس کا شراب پینا ثابت ہوجائے، یا وہ اس کا اعتراف کرلے۔ (ص ۸۶)

پاک دامن (محصن) پر الزام تراشی کی سزا قرآن، حدیث اور اجماع امت کے مطابق یہ ہے کہ الزام لگانے والے کو اسّی کوڑے مارے جائیں گے، اگر اس پر جرم ثابت ہوجائے۔ (ص ۹۰)

جہاں تک ان معصیتوں اور گناہوں کا سوال ہے جن میں حد مقرر نہیں ہے، مثلاً حرام اشیائ، مردہ یا خون کھانا، زنا سے کم تر کسی پر الزام تراشی کرنا، غیر محفوظ مال کی چوری کرنا، امانت میں خیانت کرنا یا اوقاف اور مالِ یتیم کو ہڑپ کرنا، ملاوٹ کرنا، ناپ تول میں کمی وبیشی کرنا، جھوٹی گواہی دینا، رشوت لینا، قرآن وحدیث کے برخلاف فیصلہ کرنا، جاہلی طور طریق اختیار کرنا، بدعت کی دعوت دینا، وغیرہ، ان تمام صورتوں میں مجرم کی تعزیر کی جائے گی۔ حاکم وقت حسبِ مصلحت تعزیر کرے گا۔ اگر کسی کا گناہ زیادہ ہو اور وہ بہ اصرار اسے انجام دیتا ہو تو اس کی زیادہ تعزیر کی جائے گی، ورنہ کم تعزیر کی جائے گی۔ تعزیر کی کوئی حد مقرر نہیں ہے، اس کا تعین حکم راں کی صواب دید پر ہوگا۔ (ص ۹۱)

بعض فقہاء تعزیراً قتل کو جائز قرار دیتے ہیں، جیسے وہ جاسوس جس نے دشمنوں کو

راز بتایا ہو، یا جادوگر وغیرہ۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ نے اس کی دلیل میں بعض روایات پیش کی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فسادی شخص کو جس کے فساد کو اس کے قتل کے بغیر نہ روکا جا سکے، قتل کر دیا جائے گا۔ مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

من أتاكم وأمركم جميع على رجل واحد، يريد أن يشق عصاكم أو يفرق جماعتكم فاقتلوه۔ (مسلم)

جو شخص تمہارے پاس آئے اور اس کا مقصد یہ ہو کہ تمہاری جمعیت توڑ دے یا جماعت میں تفرقہ ڈال دے، جب کہ تمہارا معاملہ (حکومت کا) ایک آدمی پر متفق ہو چکا ہو تو اس کو قتل کر دو۔

بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ سزا کی دو قسمیں ہیں: اول وہ سزا جو گذشتہ جرم کے بدلے میں دی جائے، جیسے شرابی، رہزن، چور پر حد جاری کی جاتی ہے۔ دوم وہ سزا جو مستقبل میں جرم سے روکنے کے لیے دی جائے، جیسے مرتد سے توبہ کرائی جائے گی۔ اگر وہ توبہ کر لے تو ٹھیک ہے، ورنہ اس کو قتل کر دیا جائے گا۔ (ص ۹۳۔ ۹۴)

وہ سزائیں جو اللہ اور اس کی رسول کی معصیت پر دی جاتی ہیں، ان کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ سزا جس میں مجرم پر قدرت حاصل ہو، چاہے ایک ہو یا متعدد۔ اس پر مقررہ حد نافذ کی جائے گی یا تعزیر کی جائے گی۔ دوسری وہ سزا جو ایسے مجرم سے متعلق ہو جس پر جنگ کے بغیر قدرت حاصل نہ ہو۔ اس کی اصل جہاد ہے، جو کفار اور اللہ اور اس کے رسول کے دشمنوں سے کیا جائے گا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ (الانفال: ۳۹)

اور ان سے جنگ کرو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورا کا پورا اللہ کے لیے ہو جائے۔

قرآن و حدیث میں جہاد کی فضیلت اور اس کی اہمیت سے متعلق بے شمار نصوص وارد ہیں۔ امام موصوف نے جہاد کی مختلف فضیلتیں بیان کرنے کے ساتھ اس کے مختلف مواقع کا تذکرہ کیا ہے۔ (ص ۹۶۔ ۹۷) وہ لکھتے ہیں کہ حکم راں جب لوگوں کے دین کی اصلاح کا اہتمام کریں تو اس سے خود ان کی اور رعایا دونوں کی اصلاح

ہوگی، لیکن اگر وہ ایسا نہ کریں تو دونوں کے معاملات خراب ہوں گے۔ اسی وجہ سے قرآن وحدیث میں نماز، زکوٰۃ، صبر اور جہاد کا حکم دیا گیا ہے۔ (ص ۹۸۔ ۱۱۳)

حقوق العباد میں لوگوں کی جانیں ہیں۔ قرآن وحدیث میں جان کی حرمت پر بہت سی نصوص وارد ہیں۔ قتل نفس کو گناہ کبیرہ قرار دیا گیا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَن يَقْتُلْ مُؤْمِناً مُتَعَمِّداً فَجَزَآؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِداً فِيهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَاباً عَظِيماً (النسائ:۹۳)

کسی مومن کا یہ کام نہیں ہے کہ دوسرے مومن کو قتل کرے، الّا یہ کہ اس سے چوک ہوجائے۔ رہا وہ شخص جو کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کی سزا جہنم ہے، جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہے اور اللہ نے اس کے لیے سخت عذاب مہیا کر رکھا ہے۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''قیامت کے دن سب سے پہلے خون کا فیصلہ ہوگا۔'' (بخاری، مسلم)

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ نے قتل نفس کی تین قسمیں بیان کی ہیں: قتل عمد، قتل شبہ عمد اور قتل خطا۔ قتل عمد یہ ہے کہ قاتل مقتول کو بلا کسی گناہ کے (جس میں قتل کرنے کی سزا ہے) قتل کردے، چاہے تلوار کی دھار سے قتل کرے، یا کوئی وزنی چیز اس پر گرادے، یا اسے آگ میں جلادے، یا پانی میں ڈبودے، یا گردن دبادے، یا گردن میں پھندہ لگادے، یا زہر کھلادے، یا اس کے خصیے نکال دے، جس سے اس کی جان چلی جائے، غرض کہ قتل کا طریقہ چاہے جو اختیار کیا جائے، اگر قاتل نے مقتول کی جان لے لی ہو تو وہ قتل عمد کہلائے گا اور مقتول کے وارثین کو قاتل سے قصاص لینے، دیت لینے یا معاف کردینے کا اختیار حاصل ہوگا، جیسا کہ قرآن وحدیث میں اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے (ص ۱۱۴۔ ۱۱۵) قاتل کے علاوہ کسی دوسرے سے قصاص نہیں لیا جائے گا اور نہ ایک مقتول کے بدلے کئی لوگوں کو قتل کیا جائے گا، الّا یہ کہ کئی لوگ قتل میں شریک ہوں۔ قتل شبہ عمد یہ ہے کہ قاتل نے مقتول کے ساتھ زیادتی کا ارادہ کیا ہو، لیکن اس کا مقصد قتل کرنا نہ ہو، جیسے اس نے مقتول کو لاٹھی ڈنڈے سے مارا، یا تھپڑ مارا، لیکن اس سے

مقتول کی جان چلی گئی تو اس کو قتل شبہ عمد کہا جائے گا۔ اس کی سزا دیت اور کفارہ ہے۔ قتل خطا یہ ہے کہ کسی شخص نے شکار پر تیر چلایا، لیکن وہ کسی انسان کو لگ گیا، جس سے اس کی جان چلی گئی۔ اس میں قصاص نہیں ہے، بلکہ دیت اور کفارہ ادا کرنا ہوگا۔ (ص ۱۱٦۔ ۱۱۸)

زخموں میں بھی قصاص ہے۔ لیکن قصاص کی ایک بنیادی شرط مساوات ہے، یعنی جتنا گہرا زخم لگایا گیا ہے اتنا ہی گہرا زخم لگایا جائے گا۔ اگر مساوات کو ملحوظ رکھنا ممکن نہ ہو تو قصاص کے بجائے دیت لی جائے گی یا تعزیر کی جائے گی۔ (ص ۱۱۹)

ہتکِ عزت کا بھی بدلہ لیا جائے گا۔ چنانچہ اگر کسی نے کسی دوسرے کو ملعون کہہ دیا یا بددعا دی یا برا بھلا کہا تو بدلے میں وہ بھی اسے ویسے ہی کلمات کہہ سکتا ہے۔ لیکن اگر اس نے ایسے کلمات کہے ہوں جن کا بولنا درست نہیں یا وہ جھوٹ پر مبنی ہوں، جیسے کسی کی تفسیق وتکفیر کرنا یا ماں بہن کی گالی دینا تو بدلے میں اسی طرح کے کلمات ادا کرنا جائز نہ ہوگا۔ (ص ۱۲۱)

جہاں تک میاں بیوی کے درمیان حقوق کا سوال ہے تو ہر ایک پر کچھ حقوق اور کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں۔ اس لیے دونوں میں سے ہر ایک پر واجب ہے کہ دوسرے کے حقوق بہ طیب خاطر اور شرح صدر کے ساتھ ادا کرے۔ شوہر پر بیوی کے حقوق یہ ہیں: مہر، نفقہ اور حقِ مباشرت۔ اگر شوہر جماع پر قادر نہ ہو تو ان کے درمیان جدائی کرادی جائے گی اور شوہر کے لیے بیوی پر یہ حقوق ہیں: حق مباشرت، عورت کا گھر میں ٹک کر رہنا، البتہ شوہر کی اجازت سے اور شرعی ضرورت کے تحت وہ گھر سے باہر نکل سکتی ہے۔

جہاں تک اموال کا معاملہ ہے تو اس میں عدل وانصاف کی پابندی ہوگی اور احکام شریعت کے مطابق وراثت کی تقسیم کی جائے گی۔ اسی طرح خرید وفروخت، اجارہ، وکالۃ، شراکت، ہبہ، اوقاف اور وصیت وغیرہ میں قرآن وحدیث کی تعلیمات کے مطابق معاملہ کیا جائے گا اور ان تمام حرام طریقوں سے اجتناب کیا جائے گا جن کی حرمت قرآن وحدیث سے ثابت ہے۔ معاملات میں بنیادی طور پر یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ وہی چیز حرام ہوگی جو کتاب وسنت میں حرام قرار دی گئی ہے اور عبادات میں وہی چیز مشروع

ہوگی جو قرآن وسنت سے ثابت ہو۔(ص ۱۲۳۔ ۱۲۴)

حاکم وقت کے لیے لوگوں سے مشورہ کے بغیر چارہ نہیں، جیسا کہ اللہ اور اس کے رسول نے حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ

(آل عمران:۱۵۹)

اور دین کے کام میں ان کو بھی شریک رکھو، پھر جب تمہارا عزم کسی رائے میں مستحکم ہوجائے تو اللہ پر بھروسہ کرو۔

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ: ''رسول اللہ ﷺ اپنے اصحاب سے جتنا مشورہ کرتے تھے اتنا مشورہ کرتے ہوئے میں نے کسی کو نہیں دیکھا''۔ رسول اللہ ﷺ کو اپنے اصحاب سے مشورہ کرنے کا حکم اس لیے دیا گیا تھا تاکہ ان کی تالیف قلب ہو اور بعد کے لوگ بھی اس کی اقتدا کریں۔

اگر مسلمانوں کے درمیان کسی مسئلے میں نزاع پیدا ہوجائے تو اس کے حل کے لیے انہیں اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا گیا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا

(النسائ:۵۹)

پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملے میں نزاع ہوجائے تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف پھیر دو، اگر تم واقعی اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی ایک صحیح طریقہ کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔

اولوالامر دو طرح کے لوگ ہیں: حکم راں اور علمائ۔ اگر یہ دونوں ٹھیک ہیں تو باقی لوگ بھی ٹھیک رہیں گے۔ ان میں سے ہر ایک پر واجب ہے کہ حتی الامکان قرآن و حدیث کی تعلیمات کے مطابق معاملہ کرے۔ اگر کہیں پر کوئی مسئلہ مشتبہ ہوجائے تو ان کے لیے حسب قدرت اجتہاد لازم ہے۔(ص ۱۲۷)

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ یہ جان لینا ضروری ہے کہ رعایا کا ایک

والی/حکم راں (یعنی اسلامی نظام حکومت کا ہونا) واجباتِ دین میں سے ہے۔ اس کے بغیر دین کا قیام ممکن ہے نہ دنیا کا۔ چوں کہ انسانوں کو اپنی ضروریات کی تکمیل میں ایک دوسرے سے سابقہ پڑتا ہے اور اجتماعیت کے بغیر یہ ممکن نہیں اور اجتماعیت کے لیے حاکم کا ہونا ضروری ہے (ص ۱۲۹) اسی لیے نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے: ''جب کچھ لوگ سفر کے لیے نکلیں اور وہ تین ہوں تو انھیں چاہیے کہ اپنے میں سے ایک کو اپنا امیر بنالیں۔'' (ابوداؤد) ایک دوسری حدیث میں آپؐ کا ارشاد ہے کہ ''تین لوگوں کے لیے، جو زمین کے کسی حصے میں ہوں، جائز نہیں ہے، مگر یہ کہ اپنے میں سے کسی ایک کو امیر بنالیں۔'' (مسند احمد) جب نبی ﷺ نے اس قلیل تعداد کے لیے، جو کہ وقتی طور پر اکٹھا ہو، نظام امارت کو واجب قرار دیا ہے تو بھلا پوری امت کے لیے اس کا وجوب کیوں نہیں ہوگا؟ نظام امارت کا قائم کرنا اس لیے بھی واجب ہے، کیوں کہ فریضۂ امر بالمعروف ونہی عن المنکر قوت واقتدار کے بغیر صحیح طریقے سے ادا نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح عدل وانصاف کا قیام، جہاد، مظلوموں کی دادرسی اور حدود کا قیام بھی اقتدار کے بغیر ممکن نہیں۔ اسی وجہ سے علمائے سلف حکم رانوں کے لیے دعائے خیر کرنے کی خواہش رکھتے تھے۔ علماء نے فرمایا ہے کہ اسلامی امارت وحکومت کا قیام دینی حیثیت سے واجب ہے۔ اس سے خود حاکم کو تقرب الٰہی حاصل ہوتا ہے اور وہ تقرب، جس میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت مقصود ہو، تمام تقربات سے افضل ہے۔ مگر دیکھا جاتا ہے کہ ریاست یا مال کے حصول کے معاملے میں اکثر لوگوں میں فساد پیدا ہوجاتا ہے۔ (ص ۱۳۰) جیسا کہ ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''مال وریاست کی بے جا حرص آدمی کے دین کے لیے اس سے بھی زیادہ نقصان دہ ہے جس قدر بھوکے بھیڑیے بکریوں کے ریوڑ کے لیے نقصان دہ ہوتے ہیں۔'' (ترمذی) اقتدار چاہنے والے چار طرح کے ہوتے ہیں: پہلی قسم ان حکم رانوں کی ہے جو عام لوگوں کو مغلوب ومقہور بنا کر رکھنا چاہتے ہیں اور اللہ کی زمین میں فساد پھیلاتے ہیں، جیسا کہ فرعون یا اس طرح کے حکم رانوں کی مثال ہے۔ دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو علّو و برتری کے بغیر فساد کا قصد کرتے ہیں، مثلاً چوری کرنے والے یا دیگر جرائم پیشہ

افراد۔تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جو فساد کے بغیر علّو و برتری کے متمنی ہوتے ہیں، جیسے وہ دین دار لوگ جو اپنی دین داری کے ذریعہ سے لوگوں پر تفوق اور برتری چاہتے ہیں۔ چوتھی قسم ان لوگوں کی ہے جو نیک نفس ہیں۔ یہ لوگ نہ برائی کے خواہاں ہوتے ہیں نہ فساد کے طرف مائل ہوتے ہیں۔ یہی لوگ انسانوں میں اعلیٰ وافضل ہیں اور اللہ تعالی نے انہی سے دنیا میں عزت وحکومت دینے کا وعدہ کیا ہے۔حکومت اور مال کا بنیادی مقصد تقرب الی اللہ اور اقامتِ دین ہو اور مال اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے تو اس سے دین و دنیا کی بہتری پیش نظر ہو۔ اگر حکومت دین سے محروم یا دین حکومت سے محروم ہو تو لوگوں کے معاملات میں فساد آجاتا ہے۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ نے اپنے وقت کے حالات کے پس منظر میں لکھا ہے کہ اس وقت ہمارے سامنے دو فاسد راستے ہیں: ایک راستہ ان لوگوں کا ہے جن کی نسبت دین کی طرف ہے، لیکن وہ قوتِ حرب، جہاد اور مال سے دین کی تکمیل نہیں کرتے۔ دوسرا راستہ ان والیانِ حکومت کا ہے جو مال اور جہاد سے کام لیتے ہیں، لیکن اس سے ان کا مقصد دین کی اقامت نہیں، بلکہ اپنی ذاتی حکومت واقتدار ہوتا ہے۔ یہ دونوں قسم کے لوگ راہ راست سے بھٹکے ہوئے ہیں۔ صالحینِ امت حقیقت میں وہ لوگ ہیں جو نبی ﷺ اور خلفاء راشدین کے طریقے پر عامل ہیں۔ امام موصوفؒ لکھتے ہیں کہ مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ حتی المقدور اس معاملے میں جد وجہد کریں۔ پس جو کوئی اس نیت سے حاکم بنا کہ وہ اللہ تعالی کی فرماں برداری کرے گا، دین کو قائم کرنے کی کوشش کرے گا، مسلمانوں کا ہم درد وبہی خواہ رہے گا، واجبات کو ادا کرے گا، محرمات سے اجتناب کرے گا تو وہ قیامت کے دن اس سے ان امور میں مؤاخذہ نہ ہوگا، جن کی تکمیل سے وہ عاجز رہا۔ (ص ۱۳۱۔ ۱۳۴) ☆☆☆